غالبؔ اور ترقی پسند فکر و شعور

پروفیسر علی احمد فاطمی

شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد (یوپی)، موبائل: 9415306239

اس عنوان کے تحت خیال تھا کہ غالبؔ کے شعری کمال اور جمال کے تعلق سے ترقی پسند فکر و شعور میں بالواسطہ امتزاج و انجذاب کی کیا کیا صورتیں پیدا ہوئیں اور انیسویں صدی کے اس عظیم مفکر و فلسفی شاعر سے بیسویں صدی کے ترقی پسند شعرا و ادبا نے کس نوع کا اکتساب اور احتساب کیا، اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جائے، لیکن تنگیٔ وقت اور موضوع کی وسعت و طوالت کے پیش نظر ایسا ممکن نہ ہو سکا، چنانچہ اس مقالہ میں ترقی پسند فکر و شعور خیال اور جمال سے متعلق کچھ مثالیں اور اس کے بعد شاعر و دانشور علی سردار جعفریؔ کے توسط سے چند باتیں عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

ایک خیال ہے کہ شعری و تخلیقی سطح پر سردار جعفری جس قدر انیسؔ اور اقبالؔ سے متاثر ہوئے، کسی اور شاعر سے نہیں۔ یہ خیال غلط بھی نہیں۔ اقبالؔ پر نہ صرف ان کی نظمیں ہیں بلکہ ایک مکمل کتاب بھی ہے۔ ایک اور اہم کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں بھی انھوں نے اقبالؔ پر کافی روشنائی خرچ کی ہے، لیکن انیسؔ پر ان کے مضامین کم ہی ہیں۔ شاید دو یا تین۔ جب کہ سب سے پہلے وہ انیسؔ سے ہی متاثر ہوئے اور اسی کی وساطت سے حضرت امام حسینؓ کے انقلابی کردار سے بھی۔ یہ سب باتیں بچپن یا نوجوانی میں ہوئیں، لیکن غالبؔ بچپن اور نوجوانی کے شاعر نہ تھے۔ یا یوں کہئے کہ غالبؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ایک خاص عمر، علمیت اور ذہانت اور اس سے زیادہ شعور و وجدان ضروری ہے۔ غالبؔ سے سردار کا واسطہ اس وقت پڑا جب وہ باقاعدہ میدانِ سیاست میں آئے اور تحریکِ آزادی میں زور و شور سے شریک ہوئے، پہلی بار گرفتار ہوئے اور جیل گئے۔ یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب وہ گیان پیٹھ ایوارڈ تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ اس خطبہ میں انھوں نے کہا:

> ''غالبؔ اور تحریک آزادی کے ساتھ میرا رشتہ بہت گہرا ہے۔ جب میں دسمبر ۱۹۴۰ء میں جنگ کے خلاف شاعری کرنے کے جرم میں پہلی بار گرفتار ہوا تو میرے احباب سبط حسنؔ اور مجازؔ نے ہمارے رسالے (نیا ادب) میں غالبؔ کے دو شعروں سے اس گرفتاری کا استقبال کیا:
>
> گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
> یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا
> خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
> ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

اور آگے لکھتے ہیں:

> ''اردو شاعر نے اپنے جمالیاتی سفر میں ملک اور قوم کے سیاسی سفر سے بے نیازی اور بیگانگی کا انداز کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے پاس صوفیانہ روایات کا جو ورثہ ہے اس میں مذہبی بیوروکریسی اور دنیوی بیوروکریسی دونوں سے اجتناب شامل ہے۔ شیخ، ناصح، واعظ، زاہد، ملّا، محتسب اور اسی قبیل کے دوسرے کردار اردو شاعری کے ہدف ملامت ہیں۔ ان کی تنگ نظری، انتہا پسندی، ظاہر داری، مکاری اور خود پسندی پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ ان کے مقابلے پر رندوں اور عاشقوں کی دنیا ہے جس کے دل انسانی ہمدردی سے سرشار ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے لیے انسان سے محبت کرنا ضروری ہے۔ اللہ حسین ہے اور حسن سے محبت کرتا ہے اور حسن کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات حسن کی جلوہ گری ہے اور اس جلوہ گری کے بے شمار رنگ ہیں اور بقول غالبؔ:
>
> ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
>
> قرون وسطیٰ میں یہ انداز نظر انقلابی تھا۔ زندگی کے نئے تقاضوں نے اس انداز نظر میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔ نئی تشبیہیں، نئے استعارے، نئے شعری پیکر، نئی فکر کے لیے ضروری تھے۔''

ترقی پسند تحریک کے بانی اور روح رواں سجاد ظہیرؔ، غالبؔ سے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''آج میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ غالبؔ نے میری زندگی پر اور میری طرح دوسرے ترقی پسند نوجوانوں کی زندگی پر کتنا اور کیسا اثر ڈالا۔ انسانی نفسیات کا یہ بہت پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے کہ فنون لطیفہ ہم پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ موسیقی، رقص اور نغمے کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان تمام فنون کا تعلق قدیم انسانی گروہوں

کی اس کوشش اور کاوش سے تھا جو اپنی زندگی کی بیداری قوتوں نیز انسانی نسل کو برقرار، محفوظ اور جاری رکھنے کے لیے کرتے تھے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں برس گزر جانے کے بعد بھی اور فن محض کے رجعتی اور ظلمت پرست دعویداروں کے باوجود اور ان لوگوں کے باوجود فن کا رشتہ ہماری اجتماعی اور انفرادی حیات سے توڑ کر اسے بے روح اور معلّق کر دینا چاہتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ فن کی بہترین تخلیقات اگر ایک طرف زندگی کو زیب و زینت بخشتی ہیں تو دوسری طرف وہ رفتار حیات کو تیز تر کر کے ہمیں اس جانب بڑھنے میں ذہنی اور روحانی اور نفسیاتی طور پر مدد کرتی ہیں جو کسی خاص زمانے اور ماحول میں انسانوں کے تمدّنی اور تہذیبی تزکیہ اور تشریف کا اعلیٰ ترین نصب العین ہوتا ہے۔ ان دو پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ذرا غالبؔ کے کلام پر نظر ڈالیے تب آپ کو اس کی عظیم انقلابی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔''

اس کے بعد وہ غالبؔ کے عظیم پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں اور مضمون کے آخر میں کہتے ہیں:

''غالبؔ ہمارے دلوں میں ایک آفاقی بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر کے ہماری زندگی کو ہمیشہ اور ہر لحظہ پہلے سے زیادہ پر معنی، زیادہ آزاد اور زیادہ پر جمال و پر تمکنت دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم کبھی اس کا یہ لافانی شعر فراموش نہیں کر سکتے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالبؔ کے فکر و فن کی یہی جولانی اور تابندگی اسے جاودانی بخشتی ہے۔ وہ ہماری حیات کے لطیف ترین پہلوؤں پر نور افشانی کرتا ہے اور اسے مزیّن کرتا ہے۔ رفتار و حرکت کی جانب مائل کرتا ہے اور پستیوں و محرومیوں سے نبرد آزما ہو کر تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو بلندیوں کی طرف اُٹھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اسی لیے وہ ہر حال اور ہر رنگ میں ہمارا سب سے اچھا ساتھی اور رفیقِ راہ ہے، اسی لیے ہم اس کی عزت کرتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔''

(غالبؔ، میری نظر میں)

ایک مثال احتشام حسین کی بھی ملاحظہ کیجیے:

''ماضی سے حال اور مستقبل کا کیا تعلق ہے، تغیر پذیر سماج میں روایات کی جگہ کہاں ہے اور قدیم ادب کے وہ کون سے عناصر ہیں جن کا تحفظ تہذیبی زندگی کو برقرار اور زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے؟ یہ سوالات اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ عملی زندگی میں ہمیں برابر قدیم کے بعض اجزا مٹتے اور بعض تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں بھی زوال کا مطالعہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کی شاعری اس کی ایک اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ غالبؔ آج ہمیں کیوں متاثر کرتے ہیں، بلکہ اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے کہ کل کے اشتراکی سماج میں غالبؔ کی کیا جگہ ہوگی۔ مارکس اور لینن نے ماضی کے تہذیبی سرمایہ کی افادیت جتلا کر اور اپنی پرشور و باعمل انقلابی زندگی میں اس سے دلچسپی لے کر یہ واضح کر دیا کہ انقلاب کے کسی دور میں وہ ادبی کارنامہ جو قومی ذہن اور انسانی نفس کی ترجمانی کرتا ہے کبھی بے کار نہیں ہوسکتا۔ غالبؔ کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے ترقی کی علامتوں کو، سائنس کے امکانات کو اپنے دائرۂ تخیل میں جگہ دی۔''

(غالبؔ کا تفکر)

ترقی پسندوں نے غالبؔ کو اس طرح قبول کیا۔ وہ تو ترقی پسندی کے جدید دور کا آغاز ہی غالبؔ سے کرتے ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری، ممتاز حسین کی کتابیں۔ محمد حسن، سید محمد عقیل، قمر رئیس وغیرہ کے مضامین میں بھی کم و بیش اسی طرح کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں مجھے سردار جعفری کی تخلیق و تنقید کی طرف چند اشارے کرنے ہیں۔

۱۹۴۴ء میں جب سردار جعفری کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' منظر عام پر آیا تو اس سے قبل فیضؔ کا ''نقشِ فریادی'' اور مجازؔ کا ''آہنگ'' شائع ہو چکے تھے۔ کچھ اور بھی چیزیں آچکی تھیں۔ ان سب پر غالبؔ کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے عنوانات ہی ملاحظہ کیجیے، لیکن ''پرواز'' وہ مجموعہ ہے جس میں سردار جعفری نے غالبؔ پر باقاعدہ نظم کہی، جو لینن اور اقبالؔ کے درمیان شامل اشاعت ہے۔ بعد میں یہ نظم ان کے تیسرے مجموعہ ''خون کی لکیر'' میں بھی شامل ہوئی۔ چند اشعار اس نظم کے بھی ملاحظہ کیجیے:

تیرا بربط کہکشاں، ناہید ہے تیرا رباب
آسماں کیا ہے ترے بحرِ تخیل کا حباب
تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے قبضہ میں ہے اقلیمِ سخن کی داوری
تو نے دل کے گرم سینوں کو فروزاں کر دیا
روح کو روشن دماغوں کو چراغاں کر دیا
تو مثالِ شمع ماضی کے سیہ خانے میں ہے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانے میں ہے
تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی ہیں
تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں

''تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں'' اس مصرعہ کو ملاحظہ کیجیے۔ غالبؔ کے اثرات کی پوری کہانی سمٹ گئی ہے۔ تخلیق کی سطح پر باتیں اور بھی کی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ پوری ترقی پسند شاعری میں بالعموم اور سردار جعفری کی شاعری میں بالخصوص سیاسی اور سماجی شاعری کے جو ارتعاشات وارتسامات ہیں ان پر غالبؔ سایہ فگن ہے۔ نیز جو شعری تراکیب، اسالیب حتیٰ کہ لفظیات واصطلاحات استعمال ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر غالبؔ سے ہی مستعار ہیں۔ اک ذرا بدلے ہوئے انداز میں مثلاً حکایات خوں چکاں، دشتِ امکاں، زنداں بہ زنداں، نقش ہائے رنگ رنگ، تجدید وفا، حسرت تعمیر وغیرہ۔ شعلہ لبی وکج کلاہی تو راست طور پر غالبؔ کا ہی رویہ اور زاویہ ہے۔ اسی طرح آرزو، تمنا، خواہش، چراغاں، موج تلاطم جیسے الفاظ ترقی پسند شاعروں کے یہاں بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ غزلوں میں بھی اور نظموں میں بھی۔ ترقی پسند شاعروں کے سب سے بڑے ترجمان فیضؔ نے مکالماتی انداز میں اچھی بات کہی ہے:

''غالبؔ ایک ایسے دور کا ترجمان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ ایک ایسی نسل کا نغمہ جو دفنائی نہیں گئی۔''

اب میں سردار جعفری کے دو مقدموں کا ذکر کرنا چاہوں گا، پہلا دیوان غالب کا مقدمہ، دوسرا چراغ دیر کا۔ دیوان غالبؔ کے مقدمہ میں سردار جعفری سب سے پہلے کائنات اور فرد سے متعلق غالبؔ کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر تصوف کی طرف چلے جاتے ہیں۔ وہ غالبؔ کو ہیگلؔ کے قریب پاتے ہیں۔ سردار کا کمال یہ ہے کہ وہ نہایت فکری واستدلالی انداز میں غالبؔ کی ایک نئی امیج پیش کرتے ہیں۔ وہ غالبؔ کی دل آویزی پر کھل کر باتیں کرتے ہیں اور اس میں اُمید ونشاط کی کیفیتیں محسوس کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''غالب کے غم اتنے دل آویز ہیں۔ ان میں جو بھرپور نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملے گی۔ غالبؔ کی شاعری میں غم ونشاط کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ دراصل نشاطِ غم کا شاعر ہے۔ یعنی وہ بلاؤں سے دست گریباں ہوکر سامان طرب حاصل کرتا ہے جیسے شراب کی تلخی گوارہ کرکے سرور کی منزل حاصل کی جاتی ہے، پھر وہ تلخی خود سرور بن جاتی ہے۔''

تجسس وتفحص کی اس راہ سے گزرتے ہوئے وہ غالبؔ کے ذہن میں بسے ہوئے انسان کے تصور کو تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ غالبؔ کی شاعری میں انسانی آرزوؤں اور جذبۂ شوق کے وہ پہلو بھی بہ آسانی تلاش کر لیتے ہیں جہاں غالبؔ کی نظر میں یہ پوری کائنات انسانی تمناؤں کا صرف ایک قدم بن کر رہ جاتا ہے۔

سردار جعفری نے غالبؔ کے شوق کو بھی جس طرح تلاش کیا ہے، اس سے بھی غالبؔ کی نئی جہتیں کھلتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شوق اور آرزوؤں کی لذت ہی راہ گزاروں کی لذت سے آشنا کرتی ہے اور اسی چیز نے ہی غالبؔ کی شاعری کو حرکت کے تصور سے سرشار کر دیا ہے جس کا اظہار موج تلاطم، شعلہ، سیماب، برق اور پروانہ کے الفاظ کی بہتات سے ہوتا ہے۔ یہی ساری اشیا مل جل کر غالبؔ کے جمالیاتی ذوق کی تعمیر کرتی ہیں اور طرح طرح کی امیجری بھی پیش کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر سردار غالبؔ کے اس شعر کو پڑھتے ہیں:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشن ناآفریدہ ہوں

تو اس شعر کو محض سکوں، چند پیالوں اور چند بوسوں کی آرزو تک محدود نہیں دیکھتے، بلکہ ایک ناآفریدہ گلشن سمجھ لینا غالبؔ کی توہین سمجھتے ہیں اور صاف لکھتے ہیں:

''اس میں سماجی امکانات کا تصور اس لیے شامل ہے کہ غالبؔ کے پاس سماجی ارتقا کا ایک معقول تصور تھا اور اس کی تعمیر اس کے سینے میں سب سے بڑا درد۔''

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

اور اس حسرتِ تعمیر کے حوالے سے سردار جعفری نے غالبؔ کے عہد کو چھوتے ہوئے تاریخ وتہذیب کی تبدیلی، قدامت اور جدیدیت کے تصادمات پر جو فکر انگیز بحثیں کی ہیں وہ ان کی تجزیاتی فکر اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کا ایک مخصوص وٹھوس حصّہ ہیں اور نہایت منطقی وپرکشش انداز واسلوب۔ وہ بڑے سلیقہ اور جرأت سے عظیم شاعر وفلسفی غالبؔ کی اس کمزوری کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ غالبؔ کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس نئے نظام کے سماجی رشتے کیا ہیں؟ اور اس کی فطرت میں کس طرح کی غارت گری پوشیدہ ہے؟ پھر بھی غالبؔ انسانی عظمت کے قائل تھے اور انسان کی کمزوری، مفلسی، ناتوانی سے نفرت کرتے تھے۔ ایک خط میں تو وہ صاف کہتے ہیں:

''خدا نے صرف ایمان کا شعلہ روشن کیا ہے، تمناؤں اور شہروں کی نمائش تو انسان سے ہے۔''

آتش افروزیٔ ایک شعلۂ ایماں تجھ سے
چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

خدا کو للکار کے انسانی عظمت کا اتنا بڑا اعلان، اتنی بڑی جرأت کم ہی شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ یہ غالبؔ کی ہی جسارت اور بلند آہنگی تھی جہاں سے وہ انسان کی عظمتوں کا سکّہ بٹھاتے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کی زندگی اور فن پر ماہرین اور ناقدین کی اچھی خاصی تعداد نے ہاتھ صاف کیا ہے، لیکن اصل

غالبؔ انسان دوست غالبؔ اور انسانی عظمتوں کی معرفت رکھنے والے غالبؔ کی شناخت تخلیقی وتنقیدی دونوں سطح پر کتنوں نے کی ہے۔ان پہلوؤں کی تلاش کے لیے ان پہلوؤں پر ایمان لانا بھی تو شرط ہے۔ترقی پسندی، انسان دوستی کسی مخصوص دور، گروہ اور تنظیم کی پیداوار نہیں ہوا کرتی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ لاشعوری اور غیر منظّم انداز میں رچی بسی فنکارانہ طرز پر ڈھلی ترقی پسندی فن پاروں اور فنکاروں کو جس قدر عظیم بناتی ہے، شاید بندھے ٹکے فارمولے کے انداز میں وہ صورتیں پیدا نہیں ہو پاتیں یا اگر ہو پاتی ہیں تو ان کا انداز، ان کا اسلوب کچھ ہوسکتا ہے کبیرؔ، میرؔ کا نہیں ہوسکتا یا کم از کم غالبؔ کا سا تو نہیں ہوسکتا، جن کی مخالفتیں بھی عظمتوں کو چھوتی ہیں اور بعد کا فن عظمتوں سے مخالفتوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

دوسرے مقدمے کا تعلق مثنوی ''چراغ دیر'' سے ہے۔اہلِ علم واقف ہیں کہ یہ مثنوی شہر بنارس کی تاریخ وتہذیب سے متاثر ہوکر لکھی گئی۔اسی تعلق سے سردار جعفری مقدمے کا آغاز کس قدر خوبصورت اور معنٰی خیز انداز میں کرتے ہیں:

''شاعری آرائش خم کاکل بھی ہے اور اندیشہ ہائے دور دراز بھی۔ آرائش کاکل جمالیاتی عمل ہے اور اندیشہ ہائے دور دراز ایک فلسفیانہ تجسس۔اس میں عاشق کے دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں اور معشوق کی ادائیں بھی۔بعض شاعر آرائش غم کاکل ہی کو شاعری سمجھتے ہیں اور بعض اندیشہ ہائے دور دراز کو سب کچھ جانتے ہیں۔ اگر آرائش کو رادھا اور اندیشے کو گیتا فرض کرلیا جائے تو کرشن کی عظمت کا راز کچھ کچھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ ہمارے شعرا میں اقبالؔ کے پاس گیتا فرض کرلیا جائے تو کرشن کی عظمت کا راز کچھ کچھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ ہمارے شعرا میں اقبالؔ کے پاس گیتا ہے، لیکن رادھا نہیں ہے اور جگرؔ، فیضؔ، مجازؔ کے پاس رادھا ہے، لیکن گیتا نہیں ہے۔غالبؔ کے آرائش خم کاکل اور اندیشہ ہائے دور دراز کا ایک جگہ جمع ہونا آسان ہوتا تو اب تک بے شمار کرشن اور بے شمار غالبؔ پیدا ہو چکے ہوتے۔ کرشن اور غالبؔ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ایک اوتار ہے اور دوسرا شاعر اور محض شاعر۔ ہر تشبیہ نامکمل ہوتی ہے۔ چونکہ بات فکر اور جذبے میں امتزاج کی ہے اس لیے مجھے وضاحت کے لیے کرشن سے بہتر کوئی نظر نہیں آیا۔اس معاملے میں فطرت اپنی ساری فیاضیوں کے باوجود ہانِ یار کی طرح تنگ حوصلہ ہے اور بالکل مروت کرنا نہیں جانتی۔اس کی نگاہ کرم ہر ایک پر نہیں پڑتی۔ وہ صدیوں میں کبھی کسی ایک پر اپنے فیض کی بارش کرتی ہے۔ غالبؔ پر یہ بارش کرم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ غالبؔ کے تخیل نے کائنات اور اس کے تخلیقی عمل کو اُٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لیا ہے۔''

اس کے بعد وہ غالبؔ کی عظمتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کا موازنہ فارسی شعرا سے کرتے ہیں۔اس کے بعد غالبؔ کی ہندپرستی کا بھی ذکر معنٰی خیز انداز میں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ غالبؔ نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کہا اور پھر سوال کہ کیوں کہا اور پھر جواب بھی:

''میرے خیال میں اس کی جستجو کہ غالبؔ نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کیوں کہا ہے، اس کے جمالیاتی شعور اور احساس میں کرنی چاہیے۔ غالبؔ کی شاعری میں شاعرانہ پیکروں کی جو فراوانی ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ہے۔اس نے غیر مرئی خیالات کو اور مبہم سے مبہم فکر واحساس کو بھی جسمانی پیکروں کی شکل میں بیان کیا ہے۔ غالبؔ جب حسن کا تصور کرتا ہے تو اس کو پتھروں کے سینے میں بت رقص کرتے نظر آتے ہیں۔اس کو بت خانے کی ظاہری آرائش سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ رات میں تاروں بھرا آسمان بھی اسے ایک سجا ہوا بت کدہ معلوم ہوتا ہے:

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

اس لیے میرا قیاس ہے کہ جب غالبؔ نے اپنی شاعری کو فارسی شعرا کی شاعری سے الگ کرنے کی کوشش کی تو اس کے لیے ایک ایسا غیر ایرانی استعارہ کیا جس میں ان شاعرانہ پیکروں کو آراستہ کرنے کی گنجائش ہو۔ اس لیے سومنات خیال سے بہتر کوئی استعارہ ممکن نہیں تھا۔''

سردار جعفریؔ جیسے دانشور اور بھی کئی پہلوؤں سے غالبؔ کو بڑا مانتے ہیں، اس کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ وہ دوسرا بڑا پہلوان کی وطن پرستی گردانتے ہیں۔مقدمہ میں صاف طور پر لکھتے ہیں:

''غالب کو جتنی محبت ایرانی فارسی شاعری سے تھی اتنی ہی محبت اپنے وطن ہندوستان سے بھی تھی۔ہم اس کو والہانہ محبت کہہ سکتے ہیں۔اس کی سب سے دلکش مثال مثنوی ''چراغ دیر'' ہے۔ بنارس ہندوؤں کا مقدس شہر ہے اور اس شہر کے حسن پر.....غالبؔ نے مثنوی کو ''چراغ دیر'' کا نام دیتے ہوئے گویا یہ جتایا ہے کہ گویا بنارس اس وسیع وعریض دیر کا چراغ ہے جس کا دوسرا نام ہندوستان ہے۔''

سردار جعفری نے اسے تصوف کے مختلف پہلوؤں سے بھی دیکھا پرکھا ہے۔ وہ تصوف جو ترک کائنات سے دور عملِ حیات سے گہرا رشتہ رکھتا ہے، جس کی مختلف تصویریں غالبؔ کے یہاں جھلکتی ہیں اور اس کی ارتقائی وتوسیعی

صورتیں پوری ترقی پسند شاعری میں بکھری نظر آتی ہیں۔

۱۹۶۵ء میں جب سردار جعفری کا مجموعہ ''پیراہن شرر'' شائع ہوا تو اس میں آنند نرائن ملّا کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ مقدمہ کے آخر میں انھوں نے جاندار بات کہی ہے:

''زندگی اور ادب دونوں ایک سلسلۂ لامتناہی ہیں۔ دونوں اُفق در اُفق آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ میرا خیال تو ایسا ہے کہ وہ نظام حیات کبھی بھی مرتب نہیں ہو سکے گا جس سے خوب تر کا جلولہ کچھ نگاہوں میں نہ ہو۔ یہ خوب تر کی خواہش ہی ارتقائے زندگی کا راز ہے۔ عظیم فنکار وہی ہے جس کا دیدۂ بینا اس خوب تر کو دیکھ سکے اور کاروان انسانی کو اس خوب تر کی منزل کی طرف گامزن ہونے پر آمادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں، لیکن ایک سچا شاعر ان سے ڈر کر اپنی آواز اُٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ غالبؔ کے اس شعر میں:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور چکبستؔ کے اس شعر میں:

نظر کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

اور فیض کے اس قطع میں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور اب سردار کے ''پیراہن شرر'' کے ان اشعار میں:

کھڑا ہے کون یہ پیراہن شرر پہنے
بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے
کوئی دوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک

باوجود اندازِ بیان اور علامات کے نمایاں فرق کے ایک حیرت انگیز خاندانی مشابہت ہے۔ ایک کرب جو دور بہ دور، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ انسان کے دل کی آرزو ناموافق ماحول سے لڑنے کے لیے ایک شاعر کا پیام بن کر ہمیشہ ہونٹوں تک آتی رہی ہے۔ غالبؔ کا کاغذی پیراہن سے لے کر سردارؔ کے پیراہن شرر تک یہ آرزو نہ جانے کتنے لباس پہن کر گھڑی گھڑی سامنے آئی ہے، لیکن جو چیز پیراہن شرر کو طرّۂ امتیاز بخشتی ہے وہ یہ کہ اس پیراہن شرر کے نیچے ایک پیراہن شبنم بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سلگتی ہوئی دنیا کو یہ پیراہن شبنم ابھی سالوں میسّر نہ ہو، لیکن سچے فنکار کا حوصلہ اس خیال سے پست نہیں ہوتا، وہ تو اس عقیدے پر عمل کرتا ہے:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

زندگی کے آخری ایام میں سردار جعفری نے ایک نظم کہی ''نئی نسل کے نام''۔ وہ نئی نسل کے شعرا و ادبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنے لوح و قلم تو دکھاؤ ذرا
سچ کہو کیا تمہارے تراشے ہوئے لفظ میں
میری آواز کا شائبہ بھی نہیں
میری آواز جو پہلے غالبؔ کی آواز تھی
اور پھر روح اقبالؔ کا زمزمہ بن گئی
آج کے نغمۂ شوق میں ڈھل گئی

اب میں فراقؔ گورکھپوری کے ان جملوں پر اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو سمیٹتا ہوں:

''میں پوچھتا ہوں کہ غالبؔ اگر ۱۹۴۷ء میں زندہ ہوتے تو کیا وہ پاکستان کے حامی ہوتے۔ عالمگیر رواداری اور انسان کی وحدت کو محسوس کرنے کی صلاحیت غالبؔ کو ودیعت ہوئی تھی۔ غالبؔ کی سیاسیات ایک روشن خیال و پاکیزہ ضمیر غیر سیاسی شخص کی سیاست تھی۔ مارکس کی طرح انھیں بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ انگریز غیر شعوری طور پر تاریخ کے آلۂ کار ہیں اور ایک نیا ہندوستان بن کر رہے گا۔ غالبؔ کو اس نئی حقیقت کا احساس، نئی زندگی، نئے نظام اور خود اپنے غور و فکر سے ہوا۔ غالبؔ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو'' کے قائل نہ تھے۔ ترقی پسندوں نے ترقی پسند شاعری کے ساتھ جو بھی سلوک کیا ہو، لیکن یہ کہتے ہوئے ہمیں کیوں تامّل ہو کہ غالبؔ حقیقی معنوں میں اردو کے پہلے ترقی پسند شاعر تھے۔ انھوں نے ہمارے ادب کے لیے نئی فتوحات کے امکان پیدا کر دیے۔ بیسویں صدی کا جاندار اردو ادب شعوری یا تحت شعوری طور پر غالبؔ کا مرہون منت ہے۔''

(ذکر غالبؔ)

اس امکان میں فراقؔ کی شاعری بھی شامل ہے اور پوری ترقی پسند شاعری بھی۔ ○○